Negotiations 2:1 (2022) pp. 23-37 **ISSN: 2789-293X**

نظریاتِ اقبال میں نظریہ پس نو آبادیت اور فکر رومی کا جائزہ

Study of Post – Colonial Theory According the thoughts of Rumi and Allama Muhammad Iqbal

Muhammad Aman Ullah Khan
PhD Scholar, Department of Urdu, Federal Urdu University Islamabad.

KEYWORDS

Allama Muhammad Iqbal
British Rule
20th Century
Theory of Selflessness
Post-colonial Theory
Place of Women

DATES

Received 28-01-2022
Accepted 06-02-2022
Published 20-03-2022

QR CODE

ABSTRACT

Dr. Allama Muhammad Iqbal is one of the persons known as a Thinker, Poet and Idealist of the Muslim Nation. He was born at Sialkot on 9th of November 1877. He is the man who gave an idea of living with new spirit of life. His philosophy of human being is a new theory of human life. He spent his life under British rule and saw the life so close that nobody could seek the true meaning of life under slavery of European ruler. So, he gave some new ideas which are the basic subject of this article. His theory of Selflessness, the basic right of a woman and many other can see in his poetry. His poetry is the basic thing that has given a new spirit to Muslim Nation. So, he is placed as a thinker and Philosopher of this nation. Allama Muhammad Iqbal was a poet, philosopher and politician, whose poetry in Persian and Urdu is regarded as among the greatest in modern times. He is also famous for his work on religious and political philosophy in Islam. The poet was a strong promoter of the political and spiritual revival of Islamic civilization across the world, a series of famous lectures he delivered to this effect were published as The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Allama Iqbal was a poet and a philosopher; he was always concerned about the thoughts and ideas. His words and ideas inspired many poets and thinkers. This article represents an analysis of the thoughts of Iqbal According the life of Iqbal. This article represents an analysis of the Post-Colonial Impact ،Theory of Selflessness and Place of Woman according the life of Iqbal.

DOI: https://doi.org/10.54064/negotiations.v2i1.37

ملخص اردو

9۔نومبر 1877ء کو ہندوستان کی سرزمین پر جنم لینے والا مدبر و مفکر اور توانا لہجے کا شاعر علامہ محمد اقبال نے ساری زندگی امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے اپنی بصیرت کا بھرپور استعمال کیا۔نو آبادیاتی نظام اور اس کے اثرات کے حوالے سے اقبال اپنی گہری فکری، بصیرت اور سیاسی میدان

کا شاہ سوار ہونے کے ناطے اس حقیقت سے بہ خوبی واقف تھے کہ مستقبل میں امت مسلمہ پر نو آبادیاتی نظام کے اثرات کس طرح خطرناک اور مہلک ثابت ہوں گے۔ اسی بنا پر انھوں نے ہندوستانی قوم خاص کر مسلمان قوم کو اپنی تہذیب و ثقافت اور علم و فکر و فن کے اعتبار سے ایک اکائی بننے کی نہ صرف دعوت دی بل کہ اس کے لیے عملی اقدام بھی اٹھائیے۔ اقبال اپنے وقت کی مقامی و غیر مقامی سیاست سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ وہ بہ خوبی اندازہ لگا چکے تھے کہ وہ قوم جو ایک عرصہ دراز سے نو آبادیاتی نظام کے ہاتھوں کھلونا بن چکی ہو اور اس نظام کے تحت سانس لینے پر مجبور ہو اس کی اخلاقی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، فکری، اقتصادی، معاشی اور معاشرتی حالت کس حد تک گر چکی ہے۔ اقبال اسلام کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے گرویدہ تھے۔ اقبال اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ اسلامی تہذیب درد مندی اور اخوت بھائی چارے کی علمبردار تھی۔ جدید نسل تاریخ اور تاریخ میں موجود اقبالؒ کے فکری پہلوؤں سے اگر مکمل واقف نہیں تو اُن کے افکار سے روشناس بھی نہیں ہے۔ جہاں انسان کو انسان کم اور حیوان سے بدتر درجہ ضرور ملا ہے۔ تاریخ کی اس ظالم و جابر سوچ سے اگر کسی نے اردو ادب میں پردہ اٹھایا ہے اور اس بدسوچ کا راز کسی نے فاش کیا ہے تو ان میں جعفر زٹلی کے بعد اکبر الٰہ آبادی کا نام آتا ہے جس نے طنز و مزاح کے پردے میں عوام الناس کو اس سوچ کی طرف مائل کیا اور ایک مزاحمت پیدا کرنے کی کوشش کی جس کے سبب عوام الناس میں شعور نے کچھ آنکھ کھولی۔ اسی شعور کو لاشعور سے مکمل شعور میں لانے میں ایک اہم کردار مفکّرِ اسلام اور دردمندانِ مسلم اُمّہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کی کاوش بھی شامل ہے۔ وقت کی ضرورت ہے کہ نسلِ نو کو نہ صرف اقبالؒ کی زندگی سے متعارف کروایا جائے بل کہ اقبالؒ کی فکر کو عام کرنے اور ان کی فکر کو سمجھنے کے لیے باقاعدہ ایسے ادارے قائم کیے جائیں جو ان کی فکر کو تفکر کے صلائے عام بنانے میں اپنا کردار ادا کریں تاکہ ہماری آنے والی نسلیں اس ذہنی و فکری سوچ کی غلام نہ بن جائیں جس کے تابع کرنے کے لیے مغرب اپنا مکمل زور لگا رہا ہے۔ اقبالؒ کی ہی شخصیت ہی وہ شخصیت ہے جو آج ذہنی و فکری غلامی میں ڈوبی ہوئی قوم کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اقبالؒ ہی وہ مردِ قلندر ہے جس کی شاعری اس سوئی ہوئی قوم میں ایک نئی روح پھونک سکتی ہے اور اس کو دوبارہ وہ مقام دلا سکتی ہے جس کا خواب خود اقبال نے دیکھا تھا۔

برطانوی نو آبادیاتی نظام ہندوستان میں قائم ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ اپنے جوش میں آئی اور ہندوستان کی سرزمین کے لیے ایک دردمند بھیج دیا۔ بیسویں صدی کی ابتداء تک برطانوی نو آبادیاتی نظام اس قدر اپنی جڑیں مضبوط کر چکا تھا کہ کہا جاتا ہے کہ برطانوی اقتدار میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ مشرق سے لے کر مغرب تک اور پھر شمال سے جنوب تک قریباً دنیا کی اسی فیصد آبادی برطانوی سامراج کے تابع تھی۔ اسی برطانیہ کی نو آبادی میں ایسا زیرک انسان پیدا ہو گیا تھا کہ جو ہر محاذ پر برطانوی سامراج کو شکست دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ خدائے بزرگ و برتر نے اس کو دور اندیشی، فکر و خیال، عمیق مطالعہ اور وہ فہم عطا کیا تھا کہ جس کے سبب اس نے سوئی ہوئی قوم کو غفلت کی نیند سے جگانے کے لیے اپنی شاعری، نثر، مضامین، مکاتیب، خطبات سیاست غرض ہر طرح سے پوری کوشش کی۔ یہ انسان اپنے والدین کے لیے بھی رب کا ایک تحفہ تھا جیسا خود شیخ نور محمد اپنے خواب کا ذکر کرتے اس بچے کو رب کا تحفہ قرار دیتے ہیں۔ دنیا اس بچے کو شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کے نام سے یاد کرتی ہے۔

9۔ نومبر 1877ء کو ہندوستان کی سرزمین پر جنم لینے والا مدبر و مفکر اور توانا لہجے کا شاعر علامہ محمد اقبال نے ساری زندگی امت مسلمہ کی رہ نمائی کے لیے اپنی بصیرت کا بھرپور استعمال کیا۔ نو آبادیاتی نظام اور اس کے اثرات کے حوالے سے اقبال اپنی گہری فکری، بصیرت اور سیاسی میدان کا شاہ سوار ہونے کے ناطے اس حقیقت سے بہ خوبی واقف تھے کہ مستقبل میں امت مسلمہ پر نو آبادیاتی نظام کے اثرات کس طرح خطرناک اور مہلک

ثابت ہوں گے۔ اسی بنا پر انھوں نے ہندوستانی قوم خاص کر مسلمان قوم کو اپنی تہذیب و ثقافت اور علم و فکر و فن کے اعتبار سے ایک اکائی بننے کی نہ صرف دعوت دی بل کہ اس کے لیے عملی اقدام بھی اٹھایئے۔ اقبال اپنے وقت کی مقامی و غیر مقامی سیاست سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ وہ بہ خوبی اندازہ لگا چکے تھے کہ وہ قوم جو ایک عرصہ دراز سے نو آبادیاتی نظام کے ہاتھوں کھلونا بن چکی ہو اور اس نظام کے تحت سانس لینے پر مجبور ہو اس کی اخلاقی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، فکری، اقتصادی، معاشی اور معاشرتی حالت کس حد تک گر چکی ہے۔ اقبال اسلام کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے اور وہ اسلامی تہذیب و ثقافت کے گرویدہ تھے۔ اقبال اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ اسلامی تہذیب دردمندی اور اخوت بھائی چارے کی علمبر دار تھی۔ اسی اسلامی تہذیب کے اس بنیادی نکتے کی بنا پر مسلمان آپس میں "رُحَمَآءُ بَیۡنَھُمۡ" اور "اشد آءُ علَی الکُفّار" ایک دوسرے کے لیے ابریشم کی طرح نرم اور دشمن کے لیے فولاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال نے ہمیشہ ایسی تہذیب و ثقافت کی خواہش رکھتے تھے جو مادیت پرستی کی بجائے روحانیت اور روحانی اقدار پر مبنی ہوں۔ اقبال ایسی زندگی کے متمنی ہیں جو روحانیت سے بھرپور ہو اور ایسی شان و شوکت والی زندگی جو لامتناہی ہو۔ ظاہر ہے ایسی زندگی کی بنیاد قرآن و سنت سے ماخوذ ہو سکتی ہے۔ خدائے رب ذوالجلال سے ملاقات کی جستجو اور پاک پیغمبر ﷺ کے قرب کی خواہش اس زندگی کا خاصہ ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک ایک مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دل میں اسی جستجو اور خواہش کا چراغ روشن رکھے تاکہ وہ آزاد زندگی کی ایک زندہ مثال بن سکے۔ ان کا یہ مشاہدہ بہت واضح اشارہ دے رہا تھا کہ نو آبادیاتی نظام کے شکنجے میں جکڑے ہونے کی وجہ سے مقامی آبادی میں بے دلی، بے احتیاطی اور ضرورت سے ہٹ کر کام کرنے کی کیفیت پیدا ہو چکے تھے۔ اقبال اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر یہ حقیقت جان چکے تھے کہ نو آبادیاتی نظام نے مقامی آبادی خاص مسلمانوں کی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کر چکا تھا۔ مسلمانوں کے ماضی کی درخشاں روایات اور ان کا احساس تفاخر، ندامت و پشیمانی، میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا ماضی جو مضبوط اور بے باک شخصیت اور جرأت رکھنے کے باوجود بزدل اور بودے پن کا شکار ہو کر اپنی آخری منزل کی طرف رواں دواں تھا اور مسلم تہذیب اپنے آخری سانس لے رہی تھی جس نے ایک بے یقینی کی کیفیت پیدا کر رہی تھی اور بے یقینی بذات خود غلامی سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔ ان میں حالات میں علامہ اقبال کی شاعری مسلم امہ کے لیے آکسیجن کا کام دے رہی تھی۔

اقبال کے نظریہ خودی کو پڑھنے سے پہلے بات جو خیال کی دنیا میں گردش کرتی ہے وہ یہ علامہ محمد اقبالؒ کا یہ نظریہ دراصل "نو آبادیاتی نظام" کے خلاف ایک رد عمل ہے کیوں کہ انسان کی خودی اسے آزاد فضاؤں میں سانس لینے اور صرف ایک ذات خدائے واحد کا غلام بناتی ہے۔ درس خودی بھی اسی سلسلہ کی کڑی معلوم ہوتی ہے جس کے سبب انسان خلاصہ کائنات ہے اور کائنات کی تخلیق میں بنیادی کردار اسی انسان کا ہے جیسا کہ قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ جو انسان اپنی ذات کو پہچان گیا گویا اس نے کائنات کے خالق کو پالیا۔ اللہ پاک اور فرشتوں کا مکالمہ، انسان کا فرشتوں پر برتری لینا، مسجود ملائک ہونا یہ سب انسان کے اشرف المخلوقات ہونے پر دال ہیں۔ پھر انسان اپنی خودی بیچ کر کسی اور کا غلام بن جائے اور اپنی خودی پر کسی اور کو برتر سمجھے تو پھر اقبال کا پیغام اس "بانگ" کی مانند ہے جسے سن کر ہر ذی شعور انسان اپنے شعور کی دنیا میں محو ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں نو آبادیاتی نظام کے تہذیبی و ثقافتی علمی و فکری، نفسیاتی، عمرانیاتی اور اقتصادی اثرات پر گہری چوٹ ملتی ہے، خودی کے تجزیاتی فہم سے نو آبادیتی نظام کی جھلک صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ اس حوالہ سے قاضی جاوید لکھتے ہیں: "نظریہ خودی کی تشریح و توسیع کی جانب کافی توجہ دی گئی ہے تاہم اس حقیقت کو مسلسل نظر انداز کیا گیا ہے کہ یہ تصور براہ راست نو آبادیاتی نظام کے خلاف ایک رد عمل ہے۔ خود علامہ نے اس کی جانب کئی

اشارے کیے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ صرف خود کی موت کی بنا پر ہندی شکستہ بالوں پر آشیانہ حرام اور قفس حلال ہوا ہے اور یہ کہ ہر وہ قوم جو اپنی خودی کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ مظلومی و محکومی کا شکار ہو جاتی ہے یہ اس کا ناگزیر مقدر ہے"[1]

قرآن پاک بھی اس پر دلیل ہے: "ومن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ"[2]

ترجمہ: جس نے بھی کفر و شرک کا انکار کیا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا پس تحقیق اس نے ایک مضبوط سہارا پکڑ لیا۔

لہٰذا اقبال کے نزدیک بھی انسان پر یہ حقیقت اس وقت منکشف ہو گی جب وہ اپنی خودی کا ادراک کرے گا۔ خودی دراصل آزادی کا راستہ ہے۔ احساس خودی کے فقدان کے سبب قومیں غلامی اور غلامانہ نفسیات کا شکار ہو جاتی ہیں جو ان قوموں کی تباہی و بربادی کا پیغام ہے۔ ایمان کی کمزوری دراصل انسان کو غلامی پر مجبور کرتی ہے اور اقبال کا نظریہ خودی اس پیغام کو عام کرنے میں ایک اعلان کے مترادف ہے۔ اقبال اس پیغام اور اعلان سے بہ خوبی آگاہ تھے۔ اقبال نو آبادیاتی نظام اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والی حاکمیت، غلامی اور غلام پرور ذہن سازی کے حیلے بہانوں سے بھی خوب واقف تھے یہی وہ حیلے بہانے ہیں جو مختلف اقوام کو غلامی پر رضامند رکھنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ جمہوریت، اخلاقیات، معاشرت، انسانیت اور انصاف کے نام پر ظلم و جبر، استحصال اور مکر و فریب ہی دراصل اسامریت، ملوکیت اور نو آبادیت کا اصل چہرہ ہیں۔ اقبال کے مطابق نو آبادیاتی نظام اور نو آباد کار اپنے معاشی، اقتصادی، سیاسی فکری اور ثقافتی مفادات کے حصول کے لیے ابلیسی ضابطہ اخلاق ترتیب دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ملوکیت، شہنشاہیت، غیر ملکی طرز حکمرانی، مقامی باشندوں اور نو آبادیوں کے غریب، مفلوک الحال عوام کی شکستہ حالی اور ان مظلوم اور مقہور عوام کی تقدیر کی جبریت پر مہر تصدیق بھی ثبت کرتا ہے۔ یہی ابلیسی ضابطہ اخلاق مقامی آبادی کے باشندوں میں خوئے غلامی کو ترویج دینے اور اسی کو نجات دہندہ تسلیم کرنے اور وقت کے صوفی و ملا سے اسی ملوکیت کے حق میں کلمہ خیر کہلوانے کا سبب بنتا ہے۔ اس سارے کا نتیجہ بالآخر یہی نکلتا ہے کہ مرد حُر کی زندگی وبال بنانے کے ساتھ ساتھ آزادی کے لیے اس کی جدوجہد کو حرام ثابت کر دیا جاتا ہے جس کے سبب اس کی آزادی جیسی نعمت کو صلب کر لیا جاتا ہے۔

اقبال نو آبادیاتی دور اور نظام کے استعماری ہتھکنڈوں سے بہ خوبی واقف تھے۔ ان کی نظر فراست دیکھ رہی تھی کہ نو آبادکار انھی ہتھ کنڈوں کی بدولت سیاسی، معاشی، تاریخی، معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی جال بچھا کر وقت کے ملا اور صوفی کی نظر اور فراست کے ساتھ ساتھ ان کے نور کو بھی تہی دست کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال کے ہاں اس حقیقت کے ادراک کے بعد بہت کرب، افسوس اور غلامی سے آزادی کی تگ و دو نظر آتی ہے۔ وہ بے تاب ہو جاتے ہیں۔ بڑے واضح الفاظ میں ذکر کرتے ہیں کہ نو آبادیاتی نظام محکوم لوگوں کی رگ و جان میں اتر کر ان کے دل کو مردہ کرنے، ناامیدی اور افسردگی پیدا کرتا ہے جس کے سبب احساس کم تری پیدا ہوتی ہے اور قومیں اپنا ضمیر گروی رکھوا دیتی ہیں۔ اخلاص و مروت ختم ہو جاتا ہے۔ استعماری رنگ ڈھنگ، تہذیب و ثقافت اور معاشی و اقتصادی حالت محکوم قوم کی تہذیب و ثقافت، وقار و منزلت کو ساکت، جامد اور بے عمل کرنے میں اپنا کردار بھرپور ادا کرتا ہے اور بالآخر اپنے تابع کریک اثر و رسوخ اتنا بڑھا لیتا ہے کہ محکوم اقوام کی چیخیں سنائی بھی نہیں دیتیں۔ اقبال اس نو آبادیاتی نظام کی

---

[1] قاضی جاوید، **سرسید سے اقبال تک** (لاہور: تخلیقات، 1988ء)، 235۔

[2] القرآن، **سورۃ البقرہ**، آیت نمبر 257، پارہ نمبر 3

عطا کردہ غلامی کے سبب مسلمانوں میں تازگی، فکر و عمل کے ختم ہونے کو دیکھ رہے تھے اور انھیں اس کا کلی ادراک ہو چکا تھا کہ یہ مرض اپنے تباہ کن اثرات پھیلائے گا۔ لہٰذا بحیثیت حکیم الامت کے اس مرض کی نشان دہی کرنے اور اس کے علاج کی طرف توجہ دیتے نظر آتے ہیں۔

فکر اقبال میں محکوم اقوام خاص ہندوستانی قوم کی غلامانہ ذہنیت کے خلاف شدید رد عمل ملتا ہے۔ وہ مغرب پرستی کرنے والے افراد سے انتہائی بیزار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ دور جب مغربی تہذیب، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، اقتصادی، مذہبی، اخلاقی اور معاشی میدانوں میں دل و دماغ پر چھائے جا رہی تھی اس دور میں اقبال نے مغربی تہذیب کے کم زور پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے اسلامی نظریات فکر کی ترویج اور اسلامی تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھانے اور اسلامی فکر اور عمل کو برتر ثابت کرنے میں اپنے تمام تر اصول و ضوابط اور عملی اور عملی فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا فرض ادا کیا۔ اقبال بڑے واضح الفاظ میں پیغام دیتے نظر آتے ہیں کہ ذہنی و فکری طور پر مرعوب طبقہ ہر گز مسلمانوں کی سیاسی و تہذیبی و علمی و عملی فکر کی راہ نمائی کا اہل نہیں ہے۔ یہ اہلیت مسلم معاشرے میں فکری ارتداد کا باعث بن چکی ہے۔ ایسا طبقہ ذاتی مفادات کی خاطر قومی مفادات کا سودا کرتا نظر آتا ہے۔ اسی طبقے کے سبب نو آبادیاتی نظام اپنی جڑیں مضبوط کر چکا ہے۔ نو آبادکاری کا یہ نظام ممکن ہی نہ تھا کہ مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر چلتا۔ اقبال بھی لارڈ میکالے کی دی ہوئی تعلیمی پالیسی پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں وہ جاتے تھے کہ غلام جسمانی ہوں یا ذہنی، معاشرتی و معاشی ہوں یا تہذیبی و ثقافتی، علمی غلام ہوں یا عملی فکری ہوں یا مذہبی و اخلاقی، غلام کی ہمیشہ اپنی سوچ نہیں ہوتی وہ ہمیشہ اپنے آقا کی سوچ اور دماغ سے سوچتا ہے۔ خود کے مفادات کی خاطر استعماری ہتھکنڈوں اور استعماری مفادات کو ترجیح دینے اور ان مفادات کے سبب ملک و ملت کو بھی داؤ لگا دینے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غلاموں کی بصیرت سے پناہ مانگتے ہیں اور ہمیشہ مرد حُر کی تمنا اور آرزو کرتے نظر آتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام کے زیر اثر پروان چڑھنے والے فنون و علوم اور فکر و لطیفہ کی حیثیت اقبال کی نظر میں مشکوک ہے اور انھی کے تحت تخلیق شدہ ادب، مصوری سنگ تراشی وغیرہ بھی مشکوک ٹھہرتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہی فنون استعماریت کے نظام کے پروردہ حاکموں، مفکروں، ادیبوں اور دانش وروں کی سوچ کی عکاسی ہوتا ہے۔ اقبال نے غلامی کو ذوق حسن زیبائی سے محرومی کا دوسرا نام دیا ہے۔ ان کے نزدیک غلامی انسان کو کند ذہن بنا کر حسن لطافت سے محروم کر دیتی ہے۔ غلام کے باطن سے سوائے بے دلی، خستہ حالی اور ناتوانی کے کچھ نہیں ملتا۔

حضرتِ انسان سے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے تب سے وہ اسی فکر میں سرگرداں ہے کہ اپنے آغاز و انجام اور کائنات سے اپنے رشتوں کا معلوم کر سکے۔ کائنات اور تخلیقِ کائنات کے رازوں سے پردہ اٹھا سکے۔ فکرِ اقبال کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خدا، خودی (انسان کی ذات) اور کائنات مل کر ایک ایسی مثلث بناتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے اکمل ترین، انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے اس اکمل ترین ذات کا پرتو اور نائب جب کہ یہ کائنات اسی اکمل ترین ذات کی تخلیق جس میں حضرتِ انسان اپنے نائب ہونے کا حق ادا کر رہا ہے اور کائنات میں تخلیقی عمل ازل تا ابد جاری و ساری ہے۔ سید کرنل نواب عالم بارہوی اس حوالہ سے رقم طراز ہیں: "شاید اگر انسان کو کائنات کی رنگینیاں پریشان نہ کرتیں اور فطرت کی قوتیں اس کے سامنے مسائل کے انبار نہ لگاتیں اور شعور و علمِ انسانی اسے فکر و غور اور تجسس و تحقیق پر نہ اکساتا تو انسان کبھی بھی خدا کی تلاش میں نہ نکلتا اور روحانی وجدان کی ضرورت محسوس نہ کرتا لیکن مشکل یہی تو ہے کہ بغیر خدا سے رابطہ قائم کیے وہ اس کائنات سے نہ ہم آہنگ ہو سکتا ہے نہ مربوط، اسے یہ تکون مکمل کرنے کے لیے اس بازو کو قہراً و جبراً اپنے نظام تکوین کا جزوِ لاینفک بنانا ہی پڑتا ہے"[3]

---

[3] نواب عالم بارہوی، **بصیرت اقبال** (راولپنڈی: پیپ بورڈ پرنٹر، 1990ء)، 103۔

فکرِ اقبال کا ایک انتہائی دلچسپ پہلو انسان کی تخلیق اور رب العالمین سے اس کا تعلق ہونا ہے۔ اقبال کا انسان مسلسل پیچ و تاب کھاتا ہوا، متجسس، بے تاب، بے چین اور بے قرار رہتا ہے۔ اقبال انسان کو رب العالمین کی طرح تخلیقی فعال سمجھتے ہیں اور اس کی خودی کا مقصد انکشافِ ذات کے ساتھ ساتھ جوہرِ خودی کی نمو ہے۔ اس لیے انسان پر لازم ہے کہ وہ مستقل تحقیق، ایجاد اور تخلیق کے عمل میں خود کو مشغول رکھے۔ اقبالؒ کی فکر کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ ان کی فکر کا مرکز تعمیرِ آدمیت ہے۔ خدا اور انسان کے درمیان کا تعلق اقبالؒ کے فلسفہ خودی اور فلسفہ حیات کا مرکزی نکتہ ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرتِ انسان اس نظام کائنات میں اہم ترین ہستی ہے اور ساری کائنات کو اس کے تابع بنادیا گیا ہے۔

چناں با ذات حق خلوت گزینی
ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
بخود محکم گزر اندر حضورش
مشو ناپید اندر بحر نُورش
چناں در جلوہ گاہِ یار می سوز
عیاں خود را نہاں اُو را بر افروز [4]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے علامہ اقبالؒ کی فکر کے حوالہ سے جو رائے دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا، اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس کی تہ پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھا تھا۔ اسی بنا علامہ اقبال نے اپنے عقائد کی بنیاد تمام تر قرآن پر رکھی۔ چناں چہ انہوں نے ایک موقع پر خود فرمایا: "میں اعتقادی امور میں صرف قرآن پر انحصار رکھتا ہوں" [5]

اقبالؒ کا اپنا شعر ہی اس کی تشریح کے لیے کافی ہے ملاحظہ ہو:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں قرآن! [6]

علامہ محمد اقبال نے اس سامراجی نظام اور اس کے اثرات خاص مسلمانوں پر ان اثرات کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے ان کی سوچ و فکر کو ان کی زبوں حالی کا سبب سمجھا یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مسلمان ایک تہذیبی وحدت اور اکائی بننے کی اس لیے دعوت دی کہ نو آبادیاتی نظام کے تہذیبی جال سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لی جاسکے۔ ان کی مثنوی "پس چہ کرد اباید اے اقوام مشرق" میں نو آبادیاتی نظام کے اثرات پر گہری چوٹ ملتی ہے۔ اس

[4] حمید اللہ شاہ ہاشمی، **شرح کلیات اقبال فارسی** (لاہور: مکتبہ دانیال، س۔ن ء)، 630۔
[5] عبد السلام ندوی، **اقبال کامل** (لاہور: الفیصل ناشران، 2006ء)، 64۔
[6] محمد اقبال، **کلیاتِ اقبال (اردو): ضربِ کلیم** (لاہور: الفیصل ناشران، 2006ء)، 612۔

مثنوی میں مسلمان قوم کو ایک قوم کی حیثیت جتلانے کے لیے کئی ایک نکات اور صراحت پیش کرتے ہیں۔ مختلف مشوروں اور نصیحتوں کے سبب دانائے امت اور حکیم الامت ہونے کا فرض ادا کرتے ہیں۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اپنی تہذیب ہی وہ تہذیب ہے جس نے مغربی تہذیب کے دیے کو روشن کیا۔ مغرب کی خوش حالی، ترقی اور تہذیب و ثقافت کو بنانے میں اسلامی تہزیب ایک معمار اول کا کام انجام دیتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد دینِ اسلام ہے۔ اقبال نو آبادیاتی نظام کے استعماری حربوں کو اپنا ہدف تنقید بناتے ہوئے اپنے فکری نظام کو بروئے لا کر اس استعماریت کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کیا ہے۔ ان کے نزدیک مغربی استعماریت کی یلغار کے سبب منافقت، خود غرضی اور خود فروشی جیسے عناصر نے جنم لیا ہے۔ اس کے برعکس اقبال نے اسلام کو ایک عالمگیر تحریک کے طور پر پیش کیا۔ نو آبادیاتی نظام کے ظلم و ستم پر مستمل استعماری تسلط کے بر خلاف اقبال حقوق انسانی، عظمت بشر، آزادی ضمیر اور حق خود ارادیت کی بنا پر اسلام کو عالم انسانیت کے لیے فلاح، آزادی، خیر خواہی، صلح کل، عالمگیر مساوات پر مبنی تہذیب و ثقافت، کا داعی شمار کیا ہے۔ اسلامی نظام معاشرت اور تہذیب و ثقافت ہی دراصل حقیقت میں انسانیت پر وردہ ہے۔ اسلامی نظام ہی دراصل وہ نظام ہے جس میں رنگ، نسل، ذات، پیشہ اور طبقات کی تقسیم نہ ہے۔ ان کے نزدیک یہی وہ نظام ہے جو نو آبادیاتی و سامراجی نظام کے سامراجی حربوں کے لیے کار گر ہے کیوں کہ نو آبادیاتی و سامراجی نظام کے سامراجی حربوں کے لیے کار گر ہے کیونکہ نو آبادیاتی نظام نے عالم بشریت کی پیٹھ میں انتشار اور محرومی کا خنجر پیوست کر رکھا ہے۔ اقبال نے اسلام کو ہمیشہ ایسی قوت اور روحانی نظام کے طور پر دیکھا اور پر کھا ہے جو انسانیت کو متحد و یکجا کر سکتا ہے۔

مابعد نو آبادیاتی اثرات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو یہ نظام آج بھی کسی نئی صورت میں موجود ہے۔ مغرب کی نام نہاد مہذب اقوام اپنے سے پسماندہ اقوام پر ظلم و ستم، جبر و وحشت اور بربریت کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ مغربی خون ریزی کی تازہ ترین مثال 11/9 کے واقعات کے بعد کے حالات ہیں۔ پوری دنیا خاص مسلم ممالک اس کی زد میں ہیں۔ فلسطین، کشمیر، افغانستان، عراق، شام، لبنان، صومالیہ، یمن، روہنگیا مسلمان اور افریقی ممالک اس سفاکی کی زندہ مثال ہیں۔ اقبال اپنی فکری بصیرت کے سبب مغربی استعماریت کی ان سفاکیوں اور خون آشامیوں کو بہت پہلے دیکھ چکے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی نظم "ابلیس کی مجلس شوری" کو بطور مثال کے دیکھا اور پر کھا جا سکتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں بل کہ تمام مشرق میں زوال کا بنیادی سبب مغربی استعمار ہی ہے۔ دنیا پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین، ہسپانیہ، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، صومالیہ، عراق، روہنگیا، افریقہ ہو یا افغانستان، لبنان، بھارت، یمن ہو یا شام ہر طرف انسانیت سوز صورت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بے رحمی سے ابدی نیند سلائے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ و خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدانوں میں خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں۔ علامہ اقبال کی طویل نظمیں 1912ء سے 1936ء تک کے عرصے میں مختلف اوقات میں لکھی گئیں۔ ان نظموں کی تفہیم میں بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی کے سیاسی، تاریخی اور تہذیبی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں کا پس منظر دو سے تین ذیلی موضوعات کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

- دنیائے اسلام خصوصاً سلطنت عثمانیہ، مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور اس کی ابتری۔
- ذہنی، تہذیبی اور ثقافتی رجحانات کا اثر اور ان عوامل کا مطالعہ جو مسلم دنیا کی سیاست پر بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوئے۔
- صہیونی تاریخ کا مختصر جائزہ جس کے سبب مشرق وسطیٰ اور مسلم مفاد کو نا قابل تلافی نقصان پہنچایا۔

اسی پس منظر شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ اور خاص طور پر ابلیس کی مجلس شوریٰ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کا فکری جائزہ امت مسلمہ کے نوحے، ابلیس کے کارنامے، اسلامی نظام کی انفرادیت اورابلیسی نظام (نو آبادیاتی نظام) کے حقیقی خطرات کو نہ صرف پیش کرتی ہے بل کہ بات پوری طرح سمجھا بھی دیتی ہے اور 9/11 کے بعد کی جملہ صورت حال ہمارے سامنے آجاتی ہے اور یہی تو پس نو آبادیت ہے۔

مصادر اقبال۔ مولانا جلال الدین رومی و فکر اقبال

علامّہ محمد اقبال دنیائے اسلام کے وہ عظیم مفکّر ہیں جہنوں نے اپنے فلسفیانہ افکار کی بدولت عالمگیر شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان کے افکار و نظریات نے نہ صرف یہ کہ اسلامیانِ برصغیر کی زندگیوں میں انقلاب برپا کیا بلکہ پوری اسلامی دنیا کو خوابِ غفلت سے جگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں شاعرِ مشرق اور حکیم الامّت کے خطابات سے پکارا گیا۔ جہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ خودی، عقل و عشق، خیر و شر، جبر و قدر، حیات و ممات، فقر و تصوّف، ملت و قومیت، جمہوریت، عورت اور تعلیم کے بارے میں ان کے تصورات نے مسلمانوں کے علاوہ دیگر اقوام کے سنجیدہ طبقے کے اذہان کو بھی متاثر کیا وہاں یہ بھی درست ہے کہ ان کے افکار پر تنقید کرنے والوں اورانہیں یورپی مفکرین کا خوشہ چیں بھی قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ان ناقدین میں ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم، پروفیسر سعید جعفری، اختر رائے پوری اور مجنوں گورکھ پوری جیسے دانشور شامل ہیں۔ اقبال کے فلسفے کو ان کی فکری کاوشوں کا ثمرہ تسلیم کرنے کی بجائے اغیار کا خوشہ چینی کا نتیجہ قرار دینے کی سب سے بڑی وجہ مغرب کی علمی ترقی اور اس کی چکاچوند سے حد درجہ مرعوبیت کے ساتھ ساتھ ان مسلم فلاسفہ اور مفکرین کی آراء سے دانستہ بے اعتنائی بھی ہے جو اقبال کے فکر و فلسفے کا ہونے کے ساتھ ساتھ جدید یورپی افکار کے لیے بھی بنیادی سرچشموں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پر اغیار کی خوشہ چینی کا الزام ان کے اعلیٰ مقام و مرتبے کو اپنے مقام سے گرانے کی ایک رذیل کوشش ہے۔ ذیل میں چند مسلم مفکرین کے نام دیے جاتے ہیں جو فکر اقبال کے مصادر ہیں ان کے ساتھ ساتھ ان یورپی مفکرین کے نام بھی درج کیے جاتے ہیں جن کی خوشہ چینی کا اقبال پر الزام ہے۔ واضح رہے کہ یہاں صرف فکر اقبال کے مصادر میں سے صرف مولانا جلال الدین رومیؒ کا تفصیلی ذکر ہو گا اور اقبال پر رومیؒ کے اثرات کا مطالعہ ہو گا۔

مسلم مفکرین:

1۔ حسین بن منصور حلّاج 922ء
2۔ ابنِ مسکویہ رازی 1030ء
3۔ محی الدین ابن عربی 1240ء
4۔ جلال الدین رومیؒ 1273ء
5۔ عبد الکریم جیلی 1417ء

یورپی مفکرین:

1۔ دانتے 1321ء

2۔	ملٹن	1674ء
3۔	فشتے	1814ء
4۔	ہیگل	1831ء
5۔	گوئٹے	1832ء
6۔	نطشے	1900ء
7۔	برگساں	1914ء

مولانا جلال الدین رومیؒ تعارف

خالقِ کائنات نے ہر عہد میں کچھ ایسے نابغے پیدا کیے ہیں جو آج بھی قابلِ مثال ہیں۔ یہ نابغے نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ آج سینکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی عہد ساز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 2012ء میں امریکہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ تھے اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی شاعری رومی کی شاعری تھی۔ مثنوی مولانا روم جسے "در قرآن بہ زبان پہلوی" کہا گیا ہے۔ معارف و معنی کا اک جہاں لیے ہوئے ہے جہاں حکمت و دانائی کی مٹھاس، فکر و فلسفہ کی گہرائی مگر اس فصاحت اور سادگی کے ساتھ کہ قاری رومی کے عشق کی آگ کی تپش اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ رومیؒ ایک عظیم شاعر ہے۔ وہ تصوف پر عقیدہ رکھنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ ہے اور ان لوگوں کے لیے بھی جو ہماری مسخ شدہ تہذیب سے نالاں ہیں۔ رومی محبت، امن اور بھائی چارے کا نام ہے۔ رومی کی شاعری آشوب زدہ زمانے میں مذہب اور تہذیب کے ٹکڑوں میں بٹی انسانیت کے لیے یگانگت کا پیغام بانٹنے والی شاعری ہے۔ مولانا جلال الدین رومیؒ 30 ستمبر 1273ء کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ رومیؒ کے والد بہاء الدین ولدؒ معروف مذہبی دانشور اور صوفی تھے۔ عراق، ایران، شام اور مصر میں بڑے بڑے نامور صوفیا اسی عہد میں گزرے ہیں۔ تصوف کے بارے میں بعض ناقدین یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ اہل ہند کے قدیم فلسفہ ویدانت کا پرتو ہے۔ ظفر عظیم لکھتے ہیں: "وہ تحریک جسے ہم تصوف کے نام سے جانتے ہیں راہبانہ ریاضتوں ملک شام میں پھیلی ہوئی مادی دنیا کے برخلاف عیسائی راہبانیت، باطنی تحریکوں، زرتشتی، بدھ مت اور ہندومت کے روحانی رویوں کے سنگم سے ابھری"[7]

مولانا روم کے والد بہاء الدین ولد نوعمری میں تمام علوم و فنون میں کامل ماہر ہو گئے تھے۔ روایت ہے کہ آپ کے علم و فضل کی وجہ سے بلخ کے تین سو مفتیان کے خواب کی تعبیر کی وجہ سے آپ کو "سلطان العلما" کہا گیا۔ جس کے بارے میں قاضی علمدار حسین اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "اس واقعہ کو سلطان والد نے اپنی مثنوی میں "سپہ سالار" نے اپنے رسالے میں، افلاکی نے مناقب العارفین میں شرح وبسیط سے لکھا ہے" [8]

بہاء الدین ولد نے مولانا جلال الدین رومیؒ کی تربیت کے اپنے مرید سید برہان الدین محقق ترمذی کو اتالیق مقرر کیا۔ چار پانچ سال تک رومی آپ کی تربیت میں رہے۔ 1295ء میں بہاء الدین ولد نے بلخ سے ہجرت کی تو رومی بھی اپنے والد کے ساتھ تھے اور مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے

---

[7] ظفر عظیم، **رومی کے نغمے** (کراچی: لبرٹی بکس 2002ء)، 20۔

[8] محمد اکرام چغتائی، **مولانا جلال الدین رومی حیات و افکار** (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2004ء)، 39۔

جو اس عہد میں علم و فن کے مرکز تھے۔ اسی طرح نیشاپور میں آپ کی ملاقات فرید الدین عطار سے ہوئی۔ شیخ نے آپ کی آئندہ عظمت و جلالت کی پیشن گوئی ملاقات کے بعد کی۔ موسیٰ خان، جلال زئی اور اشفاق انور لکھتے ہیں: ''اس نے پیشن گوئی کی کہ یہ لڑکا محبت کے دلوں کے دروازے کھول دے گا۔ رومی کو مجمع الطیر نامی کتاب کے مصنف سے کی یہ ملاقات کبھی نہ بھولی''[9]

16 برس کی عمر میں گوہر خاتون سے شادی ہوئی۔ جن سے آپ کے دو بچے ہوئے۔ بہاء الدین ولد کو سلطان علاؤالدین کیقباد نے قونیہ رہائش پذیر ہونے کی دعوت دی۔ قونیہ تشریف لانے کے دو سال بعد بہاء الدین ولد انتقال کر گئے۔ مولانا روم جب اپنے والد کے ساتھ قونیہ تشریف لائے تو وہ اپنی عمر کے بائیسویں سال میں تھے۔ قونیہ تب سے مولانا روم اور آپ کی اولاد کا آئندہ کے لیے مسکن و مدفن بن گیا تھا آج بھی قونیہ کی وجہ شہرت مولانا رومؒ کے دم سے ہے۔ 24 سال کی عمر میں آپ والد کے جانشین بن گئے۔ جب بہاء الدین ولد کا انتقال ہوا تو سید برہان الدین ترمذ میں تھے آپ وہاں سے قونیہ تشریف لائے اور مولانا رومؒ سے ملاقات کی۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں: ''سید نے مولانا کا امتحان لیا اور تمام علوم میں کامل پایا تو کہا کہ صرف باطنی علم رہ گیا ہے اور یہ تمہارے والد کی امانت ہے جو میں تم کو دیتا ہوں چنانچہ نو برس تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی''[10]

ظاہری علوم میں مولانا واعظ اور درس کہتے درس دیتے لیکن ابھی تک ان کا دل اس تپش سے بے نیاز تھا جس نے جلال الدین کو عشقِ رومی بن کر جلانا تھا۔ والد کی تعلیم اور روحانی تربیت نے ان کو اپنی شخصیت دریافت کرنے کے قابل بنا دیا تھا اور اب ان کا شمار قونیہ کے قابل فخر مذہبی علما میں ہوتا تھا لیکن ابھی تک ان کو اپنے باطن کے نہاں کرب کا پتہ نہ تھا۔ یہ پتہ اس وقت چلا جب دسمبر 1294ء میں مولانا رومؒ کی ملاقات شمش تبریز سے ہوئی۔ اس ملاقات نے رومی کی زندگی یکسر بدل دی اور رومی کے اندر عشق کی آگ جل اٹھی۔ شمس سے ہی رومی نے عشق خداوندی کا درس سیکھا اور عشق کے خفیہ رازوں کو افشا کیا۔ ڈاکٹر عبد الحسن زرکوب لکھتے ہیں: ''در حقیقت اس آشفتہ اور بے سروسامانی درویش کی رفاقت سے مولانا روم کے وجود کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا ہوا کہ مولانا نے درس و تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مسند تدریس سے الگ ہو گئے۔ وہ کئی کئی دن اور کئی کئی گھنٹے شمس کے ساتھ خلوت میں رہتے اور نماز و روزہ اور واعظ کے بجائے سماع، رقص و وجد میں مشغول رہتے اور اس طرح قونیہ کا یہ مرشد زادہ ایک مضطرب شوریدہ سر درویش بن گیا[11]

شمس سے ملاقات اور پھر جدائی نے مولانا کے سینے میں عشق کی آگ روشن کر دی۔ عشق کی آگ سے بے تاب ہو کر صلاح الدین زرکوب کی صحبت میں کچھ تسلی ملی شیخ صلاح الدین کے دارِ فانی کو چ کر جانے کے سبب اپنے مرید حسام الدین چپلی کو اپنا ہمدم و ہمراز بنایا اور انہی کے کہنے پر عشق کی وہ داستان قلم بند کی جسے مثنوی معنوی کہا گیا جس کے بارے اکرم چغتائی لکھتے ہیں: ''ان کی تصانیف میں مثنوی و معنوی کو تو ''زبانِ فارسی قرآن'' کیا گیا ہے[12]

---

[9] موسیٰ خان جلال زئی، اتفاق انور، **مولانا رومی کا نظریہ عشق** (لاہور: علم و عرفان پبلی کیشنز، 1999ء)، 39۔

[10] مولانا شبلی نعمانی، **سوانح مولانا امام شمس العلماء** (کانپور: شامی پریس، 1961ء)، 15۔

[11] عبد الحسین زرین کوب، **از گلستان عجم** مترجم مہر نور محمد خان، کلثوم فاطمہ (اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی وایران، 1985ء)، 255۔

[12] محمد اکرام چغتائی، **مولانا جلال الدین رومی حیات و افکار** (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 2004ء)، 5۔

1273ء میں روحانی اور خدا کی محبت کا طلب گار، دنیا کو امن کا درس دینے والا یہ عاشق صوفی شاعر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ رومیؒ کا انسانیت پر ایمان امن بھائی چارے، امید، خوشی اور محبت کا عشق ہے۔ صوفیا کے نزدیک عشق کیا ہے؟ کہ جس کا طلب گار رومیؒ بھی ہے۔ صوفیا کا عقیدہ ہے کہ ان کی روح ایک ابدی اور لافانی عنصر ہے جس کا براہِ راست ذاتِ خداوندی سے تعلق ہے۔ یہ تعلق جزو کا کل کے ساتھ ہے۔ صوفیا ذاتِ خداوندی کو روح مطلق سمجھتے ہیں اور یہی روح مطلق حسن مطلق ہے۔ یہ ایک ایسا سرچشمہ ہے جس کے سوتے پھوٹتے ہیں اور کائنات میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ انسانی روح اس سرچشمے کو دیکھنے اور اس سے وصال کے لئے بے چین ہے۔ اس اضطراب اور بے تابی کو صوفیانہ اصطلاح میں "عشق" کہتے ہیں اور ذاتِ باری محبوب ہے اور روحِ انسانی عشاق ہے۔ صوفیاء ذاتِ باری سے عشق کے اظہار کے لیے مجازی پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ رومی کی شاعری بھی اس عشق الٰہی کی داستان ہے۔ یہ شاعری اس حسن ازل کی ترجمان ہے۔ ایک صوفی کے دل کا نغمہ عشق جب لفظوں کا جامہ پہن لیتا ہے تو وہ رومی کی شاعری میں نغمگی، حسن اور موسیقیت کی صورت میں ڈھل جاتا ہے اور یہی وہ شاعری ہے جو آج بھی سادہ عشق کے مسافروں کو اپنی منزل سے ہمکنار کر رہی ہے۔ رومی کی شاعری عشق و ہوس کہ کہانی نہیں بلکہ یہ فراق زدہ کی سرگذشت ہے جو اپنے اصل سے جدا ہو گئی ہے۔ اس کی داستان ہے جو قیل و قال کی دنیا سے نجات حاصل کر چکی ہے۔ درس و تدریس اور فتویٰ کی مسند کو خیر باد کہ چکی ہے۔ وہ ایک بے مثال اور بے پناہ عشق یعنی تبریز کے عشق سے گزر کر آئی ہے اور انجام کار وہ اپنی ہستی کو مٹا کر اپنے اصل کی طرف لوٹ جانا چاہتی ہے۔ رومی محبت اور تسلیم کا استاد ہے وہ عشق کے ذریعے نسلِ انسانی کو محبت کا درس دیتا ہے۔ شمس نے رومی اندر کیسی شمع روشن کی اور عشق کی کیسی چنگاری پھونکی کہ رومی کی شاعری میں ہم محبت کی سچی آواز سنتے ہیں۔ رومی نے ہی کہا تھا: ''فطرت کو محبت کی قوت نے اکٹھا کیا ہوا ہے''[13]

محبت عشق الٰہی سے وابستہ ہے اور عشق الٰہی کی محبت مخلوق سے وابستہ ہے۔ عشق کی اہمیت مولانا کے لیے کیا تھی؟ کہ مثنوی سے لے کر ان کی غزلیات جسے "دیوانِ شمس" کا نام دیا گیا، میں بھی عشق کی واردات کا بیان ہے۔ مگر عشق رومی کوشش اور جدوجہد کا نام ہے۔ عشقِ رومی عملی زندگی میں وسیع القلبی، وسعت نظری اور اندازِ فکر کی جدت کا نام ہے۔ رومی عمل کے لیے اس کی راہیں اور ضابطے تراشتا ہے۔ وہ زندگی سے فرار نہیں بلکہ اس سے شناسائی بڑھانے پر زور دیتا ہے۔ عشق رومی احترامِ آدمیت کا نام ہے کہ جس کی مثال رومی کی اپنی زندگی بھی تھی۔ رومی محبت اور امن کا پرستار ہے کیونکہ محبت ہی انسان کے ذہن میں روشنی پیدا کرتی ہے اور یہی روشنی ذہن وسیع، بالغ نظر اور اس کی تخلیقی قوتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ محبت دلوں میں تشکیک اور منفی قوتوں کا خاتمہ کر کے ان کے اندر روشنی، امید اور بھائی چارہ اور ہم آہنگی جیسی صفات پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب عشق رومی کی آگ سینے میں بھڑک اٹھے تو پھر اعلیٰ قدروں پر ایمان پختہ ہو جاتا ہے اور انسان آدمیت کے درجے پر فائز ہو جاتا ہے۔ رومی نے کہا:

''تا سوزی نیست آں عین الیقین
ایں یقیں خواہی در آتش در پیش''

انسان تلاش اور جستجو کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور عشق اس تلاش کے سفر میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ جیسے روم کو تبریز کے عشق نے حقیقت سے آشنائی کروائی مگر روم اور تبریز اس راہ میں شریعت طریقت اور حقیقت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مولانا روم شمس تبریز سے ملاقات کے بعد جس عظیم الشان قلبی انقلاب سے دوچار ہوئے وہ عشق کی حیرتوں کی دنیا تھی۔ اسی عشق نے مولانا روم کو آفتاب عالم تاب بنایا اور اسی عشق کے اسرار

[13] ظفر عظیم، **رومی کے نغمے** (کراچی: لبرٹی بکس 2002ء)، 180۔

مولانا نے اپنی مثنوی میں وضاحت سے روایات اور علامات کی شکل میں بیان کیے۔ رومی اس عشق کے اسرارِ نسل انسانی کو سکھانا چاہتا ہے۔ تیرہویں صدی کے وسط میں رومی نے جو کچھ کیا وہ اس صدی میں اور آنے والی کئی صدیوں تک نسلِ انسانی کی شناخت ہے۔ رومی کی تعلیمات عشق اور محبت کی تعلیمات میں اگر ہم اس کرہ ارض میں روحِ انسانی کو بچانا چاہتے ہیں تو ہمیں رومی کی تعلیمات پر عمل کرنا پڑے گا کیونکہ عشق رومی انسان کو اپنا آپ کی پہچان کراتا ہے۔ عشق رومی ہماری دکھتی روحوں کے لیے مرحم ہے۔ ہمارے روحانی مذہبی اور تہذیبی مسائل کا حل اس عشق کی قوت میں پنہاں ہے جو رومی نے بتایا۔ ہمارے ان مسائل کا حل انسانی عقل کے بس کی بات نہیں کیونکہ رومی ہمارے وجود کے اندر کی خبر دیتا ہے۔ وہ روح کی بات کرتا ہے جو اصل سے وصال کے لیے بے قرار ہے۔ صرف مثنوی میں عشق کی داستان مولانا نے نہیں کی بلکہ "دوانِ کبریا یا دیوانِ شمس" کے نام سے مولانا کی غزلیات بھی اسی تڑپ کی حامل ہیں۔ ان کی غزلیات بھی ایک خاص آہنگ ہے۔ مولانا کے افکار کے تند و تیز طوفان نے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ وہ اپنی ذات کی نفی کر چکے ہیں ان کے شعر وزن اور قافیے کی قید سے آزاد بھی ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات غیر مانوس الفاظ کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثنوی میں کچھ ایسی روایات اور تعبیرات ہیں جنہیں غیر شائستہ یا اجنبی کہا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک صوفی اور عالم کے شانِ شایاں نہیں ہے۔ اس لیے کہ مولانا کی شاعری میں عقل سے زیادہ روحانی فکر غالب ہے۔ عشق درد، حکمت، معرفت سب کو شعر و نغمہ کے پیکر میں باہر لاتا ہے۔ وہ نہ صرف روحانی کشمکش کا اظہار کرتے ہیں بلکہ فلسفیانہ افکار کو بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ دنیا، خدا روح اور آخرت جیسی تمام اہم موضوعات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ وہ ارتقائے انسانی کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ کس طرح جماداتی، نباتاتی سے حیواناتی اور انسانی ارتقا کی بلندیوں تک پہنچا۔ وہ انسان کے جبر و اختیار اور اس کی حدود کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔ وہ منزل فنا کی تصویر پیش کرتے ہیں جہاں اپنے وجود کو مٹا کر یادِ الٰہی میں گم ہو جاتا ہے۔

عشق رومی میں "نے" کی زبان میں "فیہ مافیہ" اور غزلیات میں بھی جلوہ گر ہے۔ رومی نہ ترک دنیا کی نصیحت کرتے ہیں نہ صوفیا کی بے اعتدالیوں کو پسند کرتے ہیں نہ ہی عزلت اور رہبانیت کے رجحانات کے مبلغ ہیں۔ ان کے نزدیک مرد کامل وہ ہے جو صورت اور سیرت دونوں لحاظ سے کامل ہو۔ وہ عشق کی طریقت اور شریعت کا جوہر سمجھتے ہیں اور تہذیب نفس میں محبت کو جو دل کی تربیت و تزکیہ کا سبب ہے۔ وہ عشق کو معراجِ روح کا بہترین ذریعہ سمجھتے ہیں۔ حقیقت میں عشق رومی تمام دنیاوی و روحانی بیماریوں کا چارہ گر ہے۔ مگر رومی کہتے ہیں عشق خواہ حقیقی ہو یا مجازی اس کے لیے جذبہ اصل حقیقت ہے۔ رومی کا شمار بڑے اساتذہ میں کیا جاتا ہے کیونکہ وہ نسلِ انسانی کو محبت، امن اور خوشی دینے والا شاعر ہے مگر رومی کو سمجھنے کے لیے محبت کرنے والا دل اور عاجزی و انکساری کا ہونا ضروری ہے۔

فکر اقبال اور رومیؒ

یوں تو فکر انسانی میں بیسیوں ایسے دبستان نظر آتے ہیں جن کے فکری نظام ایک دوسرے سے متصادم اور متعارض ہیں مگر جزئیات سے ہٹ کر دیکھا جائے تو زندگی کے باب میں دو نقطہ نظر ایسے ہیں جو ہر زمانے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی قنوطیت پسند اور رجائیت پسند۔ اقلیم شعر و فکر میں اس دوسرے نقطہ نظر کے دو نہایت پر جوش اور انقلاب آفریں علمبردار رومی اور اقبال کی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دونوں ماضی کے دقیقہ رس، شاہد و ناقد، حال کے ہوش مند ناظر اور مستقبل نقش گر ہیں۔ دونوں کی شخصیتوں میں ان تینوں زمانوں کا ایک ایسا حیران کن اجتماع ہے کہ تاریخ شعر انسانی میں اس کی مثالیں کمیاب ہیں۔ ڈاکٹر تحسین فراقی اپنے مضمون "اقبالؒ اور رومیؒ" میں رقم طراز ہیں:

"دونوں کا شعری و فکری سرمایہ اس پریشان کن فکری سوال کا جواب مہیا کرتا ہے کہ مادہ و معنی میں کس طرح اتحاد پیدا کر کے اسے ایک نامیاتی وحدت کی شکل دی جائے اور کس طرح موجود کو متغیر کر کے نوعِ انسانی کو آسودہ حال اور اس کے مستقبل کو روشن اور محفوظ بنایا جا سکے۔ کس طرح نزول کا عروج سے اور پستی کا بلندی سے رشتہ جوڑ کر آدمی کو انسان میں بدلا جا سکے اور اس کا ذاتِ حق سے مستحکم اور ناقابلِ شکست رشتہ قائم کیا جا سکے" [14]

اقبال کے شعری اور نثری سرمائے کو کلیتہً نگاہ میں رکھا جائے تو ان کے یہاں متعدد فارسی شعرا اور ادبا سے ربطِ فکری کے شواہد ملتے ہیں لیکن ان سب میں صرف ایک شخصیت ایسی ہے جن کے ساتھ ان کا عمر بھر کا پیمانِ عشق اور اتحادِ نظر دکھائی دیتا ہے اور وہ شخصیت ہے جلال الدین رومیؒ کی۔ ان کے شعری اور نثری کلام شیخ رومیؒ کا نہایت کثرت سے نظر آتا ہے۔ "اسرارِ خودی" سے لے کر "ارمغانِ حجاز" تک شیخ رومیؒ کا تذکرہ ملتا ہے۔ اپنی کتاب Stray Reflection سے لے کر اپنے سات انگریزی خطبات تک ہر جگہ رومی کا تذکرہ ہے اور نہایت والہانہ پن سے ان کی فکر سے خود کو وابستہ کر کے اپنے عہد کے آشوب پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اپنی متفرق یادداشتوں پر مبنی کتاب "Stray Reflection" (نظرِ ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن 1992ء) میں اقبال نے دو مقامات پر رومی کا ذکر کیا ہے اور دونوں جگہ نہایت والہانہ پن سے رومی کی غیر معمولی نکتہ آفرینی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ ایک جگہ تمثیلات "Parables" کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں: "زندگی کی عمیق ترین صداقتوں کو روزمرہ تمثیلوں کی صورت میں بیان کرنے کے لیے ایک غیر معمولی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ شیکسپیئر، مولانا روم اور عیسیٰ غالباً اس نادر و نایاب طبّاعی کی واحد مثالیں ہیں" [15]

اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر رومیؒ کے نسبتہً مفصل ذکر میں نٹشے سے اس کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے افکار کے اعتبار سے رومیؒ اور نٹشے میں بعد القطبین پایا جاتا ہے مگر ادبیات اور فکر کی تاریخ میں اتفاق اور اختلافات کے نکات خاص دلچسپی کے حامل چیز سمجھے جاتے ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: "گہرے فکری اختلافات کے باوجود یہ دو عظیم مفکر شاعر زندگی پر اپنی فکر کے عملی اثرات کے اعتبار سے کامل طور پر مشابہ ہیں۔ نٹشے اپنے ارد گرد نوعِ انسانی کو حالتِ زوال میں دیکھتا تھا۔ اس نے اس زوال کے پس پردہ بر سر عمل قوتوں کو منکشف کیا اور آخر کار اس طرزِ زندگی کو واضح کرنے کی کوشش کی جو ہمارے سیارے کے لیے موزوں تھی۔ اس فکر کا مرکزی نکتہ اس کا یہ قول تھا: یہ اہم نہیں کہ انسان کو کس طرح محفوظ کیا جائے بلکہ یہ امر اہم ہے کہ کس طرح انسان کو اس کی محدودیتوں سے بالاتر لے جایا جائے۔ بے مثال رومی نے مسلم دنیا میں ایک ایسے عہد میں ظہور کیا جب حیات و افکار کو اضمحلال سے دوچار کرنے والے عناصر اور بظاہر پرکشش مگر بہ باطن ضعیف کن ادبیات نے مسلم ایشیا کا کم و بیش سارا خون چوس لیا تھا اور تاتاریوں کے لیے آسان فتح کا راستہ ہموار کر دیا تھا۔ رومی نٹشے سے حیات کے افلاس، نااہلیت اور معاشرتی ڈھانچے کے زوال کے باب میں کسی طرح بھی کم حساس نہیں تھے" [16]

اقبال نے رومیؒ میں مرید و مراد کے باہمی عقیدت مندانہ اور احترامی رشتے کے باوجود ایسا نہیں ہے کہ اقبال نے رومی میں اہنی شخصیت کو گم کر دیا ہو۔ رومیؒ سے اقبال کی فیضان اندوزی کسی اندھے بہرے مقلد کی نہیں، بلکہ ایک وسیع النظر اور کمال تربیت یافتہ، پختہ فکر دانشور کی ایک دوسرے بے

---

[14] تحسین فراقی، **"اقبالؒ اور رومیؒ"** لاہور، روزنامہ جنگ، 9 نومبر 2017ء، ص 15

[15] ایضاً

[16] ایضاً

نظیر متکلم، عالم اور حامل حکمت و حرارت اور عرفان الٰہی کی فیض یافتہ شخصیت سے اثر پذیری ہے۔ دونوں اپنے اپنے دائرے میں بے مثال مفکر شاعر کہے جاسکتے ہیں اور دونوں کا انتہائی چشمہ فیض اندوزی، الہام ربانی ہے۔ رومیؒ کے عہد پر نگاہ ڈالیں تو احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے پر آشوب اور گھٹے ہوئے ماحول میں سانس لے رہے ہیں جس پر خوف، دہشت، تقدیر کی جبریت اور بے یقینی کا آسیب مسلّط ہے۔ فتنہ تاتاری اور چنگیزی فوجوں نے بر اعظم ایشیا اور بر اعظم یورپ کے بعض حصوں کو تاخت و تاراج کیا اور جرمنی کے مشرقی سرحدات سے لے کر جاپان کے ساحل سمندر تک کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ غرض جہاں کہیں یہ گئے موت اور تباہی کی داستان رقم کرتے گئے، یہ مرکزی اناطولیہ تک رسا تھے۔ رومیؒ اسی فتنہ انگیز عہد میں سانس لے رہے تھے اور اس فتنہ پرور دور کے عمل کے برعکس اپنے عہد کے لیے گویا ایک نیا عہد نامہ بشارت تحریر کر رہے تھے جس کے رگ و پے میں بلند نگہی، رجائیت، حوصلے، مبارز طلبی اور نئے امکانات کا لہو رواں دواں تھا۔ شاید اسی لیے رومیؒ کی مثنوی معنوی کو بعد از اسلام کا ایک حماسہ قرار دیا۔ اقبال نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ عہد بھی بد قسمتی سے مسلم ملت کا زوال تھا اور مسلمانوں کے لیے گویا ایک فتنہ کبریٰ۔ یہاں بھی منفی تصوراتِ حیات نے صحت مند زاویہ ہائے نگاہ کی جگہ لے لی تھی۔ مسلم دنیا کے بڑے حصے پر مغربی استعمار کا تسلط تھا۔ اس حادثے نے بے یقینی، یاس، بے سمتی، خود فراموشی اور نفی خودی کے تصورات کو عام کیا۔ رومیؒ اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے عہد کے انسان کو حوصلہ مندی، احساس عظمت اور مبارزہ طلبی کا سبق دیا۔ یہ سبق آج بھی آفاقی نوعیت و اہمیت کا حامل ہے۔ رومی نے انسان کی عظمت اور انسانی عظمت کے امکانات کا ذکر بڑے جوش و جذبہ کے ساتھ اپنی مثنوی اور اپنے ملفوظات "فیہ مافیہ" میں کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے تصور خودی کے پس پشت زیادہ تر رومی کا کسی قدر بیدل کا حرکی تصور حیات کار فرما ہے۔ "بال جبریل" کی مشہور طویل نظم "پیر و مرشد" اقبال کے استفسارات اور رومیؒ کے جوابات پر مشتمل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم رومیؒ کے تصور علم، تصور تہذیب، تصور انسان، قوموں کے عروج و زوال اور تصور جبر و قدر وغیرہ کی اجمالی مگر بڑی عمیق سطح پر وضاحت کرتی ہے۔ علاوہ ازیں اقبال کے تخلیقی شاہکار جاوید نامے میں رومیؒ کی رہنمائی میں سفر عروجی و افلاکی کے دوران انسان، خدا اور کائنات اور حیات و ممات کے امور پر جس قدر چشم کشا حقائق ملتے ہیں اور عقبیٰ کے دوش بدوش دنیا کو معنوی طور پر قابلِ رشک مقام بنانے کے ضمن میں جن فکر انگیز نکات کی طرف اشارے ملتے ہیں وہ سب حد درجہ قابلِ توجہ ہیں۔

جاوید نامے میں بھی اقبال کے استفسارات کے ضمن میں رومی اپنے تصور حیات و تصور خودی، تسخیر فطرت کے اسالیب اور معارفِ خلوت و جلوت، وصول الی اللہ، تصور معراج اور تصور زمان و مکان کی وضاحت کرتے ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ نظم "پیر و مرید" میں رومی کے جوابات خود ان کے اپنے اشعار کی صورت میں ہیں اور یہاں جوابات اقبال نے اپنے الفاظ میں ترتیب دیے ہیں مگر اس ایجاز اور مہارت کے ساتھ کہ ان کی قدرت کلام پر رشک آتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ رومیؒ کے تصور عشق سے متاثر ہیں بلکہ دونوں کے یہاں تصوف کے بارے میں بھی مماثل خیالات ہیں۔ رومیؒ کی طرح اقبال نے بھی عجمی تصوف کے منفی عناصر کو ہدف تنقید بناتے ہیں اور اس ضمن میں ان کے یہاں بڑا شدید رویہ پایا جاتا ہے۔ رومی کی طرح وہ بھی عجمی تصوف کے فنا کے تصورات پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ رومی کا موقف ہے کہ اگر فنا کے بعد بقا کی طرف پیش رفت نہ ہو تو یہ نوعِ انسان کے لیے زیاں بخش ہے۔ معروف دانشور اے ایچ کمالی نے "فکر اسلامی ورثہ" کے زیر عنوان رومی کے تصور عشق پر بحث کرتے ہوئے یہ نقطہ اٹھایا ہے کہ رومیؒ کے لیے عشق اخلاقی طرزِ عمل کے ایک اصول کا درجہ رکھتا تھا۔ عرفان کے ایک اصول کی حیثیت سے اس کا انجام سمندر کی وسعتوں میں گم ہو جانے کے سوا کچھ نہیں۔ رومی کے نزدیک محبت کا تجربہ سالک کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور وہ اپنے اندر مطلوب و محبوب کی صفات کو پیدا کر لیتا

ہے اور نہ صرف شاعری میں بلکہ اقبال نے اپنے اہم ترین نثری کارنامے "جدید تشکیل الٰہیات اسلامیہ" میں بھی کئی جگہ رومی کا ذکر کمال شیفتگی سے کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے تیسرے، چوتھے اور ساتویں خطبے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ کیا یورپ اور خصوصاً امریکہ میں رومیؒ کی روزافزوں اور حیرت انگیز مقبولیت کا سبب یہی تو نہیں کہ اس نابالغ اور کھوکھلی تہذیب کے پرستاروں کو رومیؒ کی صورت میں ایک ایسا نجات دہندہ دکھائی دیا ہے جو ان باطن میں آتشِ شوق کی چنگاری روشن کر سکتا ہے کہ یہی کام روشن ضمیر حضرات تہذیبوں کے بجھتے چراغوں کو سہارا دینے کے لیے ہر دور میں کرتے رہے ہیں۔

☆☆☆